نقطۂ نظر — سیف اللہ بے قرار

مولانا فضل الرحمن ، حالات کے آئینہ میں

صوبہ سرحد میں عملاً قادیانی بیوروکریسی کا راج ہے

مرزائی مبلغ قلندر مومند کے لئے ستارہ امتیاز ، ذمہ دار کون ؟

ذیل کا مضمون ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک قاری جناب سیف اللہ بیقرار صاحب نے اشاعت کی غرض سے ارسال کیا۔ انہوں نے موجودہ سیاست کے حوالے سے سیاسی علماء کے طرزِ عمل کا شکوہ بھی کیا اور ناکامی کے اسباب کا تجزیہ بھی مضمون کے بعض حصوں سے ادارہ کو اتفاق نہیں ہے لیکن یہ ایک درد مند مسلمان کے دل کی آواز اور شدید ردِ عمل ہے۔ جناب سیف اللہ بیقرار صاحب نے جمیعت علماء اسلام کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لئے جن حضرات کو اپنا کردار ادا کرنے کی دعوت دی ہے ان میں سرِ فہرست فرزندانِ امیرِ شریعت کو بھی شامل فرمایا ہے۔ یہ انکا حسنِ ظن ہے جس کے لئے ہم انکے شکر گزار ہیں لیکن واضح رہے کہ فرزندانِ امیرِ شریعت تو خود گزشتہ پینتیس برسوں سے جمیعت علماء اسلام اور اسکے اعوان و انصار کی نفرتوں ، کدورتوں ، بغض و حسد اور تعصبات کا شکار چلے آرہے ہیں اس کارِ خیر میں کیسے موثر ہوسکتے ہیں ؟ وہ تو اپنی عزت اور اپنی جماعت مجلسِ احرار اسلام کو ان حضرات اور انکے "اہداف" سے بچا کر بالکل الگ تھلگ ہوگئے۔ وہ نہ تو انکے کارناموں میں شریک اور نہ اس وی آئی پی قطار میں شمار ہیں۔ البتہ باقی بزرگ اس معاملہ میں شاید انکی امیدوں پر پورا اتر سکیں۔ (ادارہ)

چند سال بیشتر ڈیرہ اسماعیل خان کو جمیعت علماء اسلام کی راج دھانی اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا مفتی محمود کی زندگی میں بڑے بڑے نواب اور نامی گرامی تمندار و جاگیر دار کسی بھی معاملہ میں جی یو آئی کے مقابل آنے سے گریز کرتے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے بڑے کروفر کے ساتھ مفتی محمود کے انتخابی حریف کی حیثیت سے ڈیرہ اسماعیل خان کی نشست پر قسمت آزمائی کی لیکن ہزیمت آمیز شکست سے دوچار ہوئے اور یہی حزن روگ جان بن کر انہیں عمر بھر ستاتا رہا۔ وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کے بعد جب بھی ڈیرہ اسماعیل خان آتے تو مفتی محمود کو ہدف تنقید بنانے سے نہ چوکتے۔ ایک مرتبہ مقامی حقنواز پارک میں منعقدہ جلسہ عام میں اعلان کر ڈالا کہ "آئندہ الیکشن میں بندر کو پی پی پی کا ٹکٹ دے کر مفتی محمود کے مقابلہ میں کامیاب کرایا جائے گا" کچھ عرصہ بعد اسی پارک میں مفتی محمود مرحوم و مغفور نے جلسہ سے خطاب کیا۔ تقریب کے دوران انکی رگِ ظرافت پھڑکی اور جواب آں غزل کے

طور پر کہا کہ "بڑا بندر تو آج تک اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا ہے چھوٹا بندر میرا کیا مقابلہ کر پائے گا" ۱۹۷۷ء میں الیکشن منعقد ہوئے تو پیپلز پارٹی نے موجودہ سنیٹر گلزار احمد خان کو مفتی محمود کے مقابلہ میں امیدوار نامزد کیا۔ اس وقت ان کی شہرت کی وجہ زرداری سے یاری اور شراکت داری نہ تھی۔ بلکہ وہ گلزار خان کلیموں والے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ رازہائے نہاں خانہ سے آگاہ لوگوں کے مطابق وہ ابتداء میں مولانا کی مقبولیت سے خائف ہونے کے باعث مولانا کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت کے حکمرانوں کی بعض یقین دہانیوں کے نتیجہ میں الیکشن لڑنے پہ آمادہ ہوئے۔ انہی کے کہنے پر سردار عطاء اللہ خان میاں خیل سے کلاچی کی نشست کے لئے پیپلز پارٹی کا عنایت کردہ ٹکٹ واپس لیکر سردار عنایت اللہ خان گنڈہ پور کو دیا گیا۔ یاد رہے کہ سردار عنایت اللہ خان گنڈہ پور ان دنوں ائیر پورٹ قتل کیس میں ملوث ہونے کی وجہ سے جیل میں تھے۔ پولنگ کے دن مفتی صاحب کو ناکام بنانے کے لئے حکومتی وسائل کا بے دریغ استعمال ہوا۔ حتی کہ غیر سرکاری نتائج جاری کرنے میں بھی تاخیر کی گئی۔ لیکن عوامی تائید وحمایت کے آگے کوئی چال کارگر ثابت نہ ہوسکی اور بھٹو کے اعلان کے برعکس کامرانی کا سہرا ایک بار پھر مفتی کے سر سجا۔ ان کی وفات کے بعد جے یو آئی دولخت ہوئی۔ ایک گروپ کی قیادت مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف آف کلاچی نے سنبھالی اور وقت کے حکمران جنرل محمد ضیاءالحق سے ناطہ جوڑا۔ جنرل کی نظر شفقت نے انہیں مجلس شوری اور پھر ایوان بالا تک پہنچانے اور معاشی حالات سدھارنے کے مواقع مہیا کئے۔ قربت شاہی کے باعث وی آئی پی تو بن گئے لیکن عوام کے ذہنوں سے ایسے مٹے کہ اب انہیں اپنے وجود کے اظہار کے لئے صرف اخباری بیان جاری کرنے پر ہی اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کی سیاسی مقبولیت بہ ایں جا رسید کہ بلدیاتی کونسلر منتخب ہونا محال ہوگیا۔ شاید وہ بھول گئے تھے کہ اقتدار پسند علما عوام کے نزدیک قابل تکریم نہیں رہتے خود جمیعتہ علماء اسلام کے مقتدر رہنما اور شعلہ بیان مقرر مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم جب تک حکمرانوں سے دور رہے تو وہ دلوں کے تاجدار تھے۔ لوگ انہیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے۔ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تعلق قائم کیا تو لوگوں نے آنکھیں پھیر لیں اور وہ میدان سیاست میں کٹی پتنگ بن کر رہ گئے۔ وقت کے بے رحم مؤرخ نے بھی انہیں فراموش کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ بھول کر بھی انکا نام لینے والا کوئی نہیں۔ جہاں تک جے یو آئی کے دوسرے دھڑے کا تعلق ہے تو مفتی محمود مرحوم کے مخلص رفیقوں اور عقیدت مندوں نے سیادت کا عمامہ ان کے فرزند مولانا فضل الرحمان کے سر باندھا۔ مولانا فضل الرحمان نے سیاست میں نو وارد ہونے کے باوجود جنرل محمد ضیاء الحق کے مارشل لاء میں بحالی جمہوریت کی خاطر پابند سلاسل رہنے کو ترجیح دی۔ اسی طرز عمل سے ان کے سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ ہوا۔ اور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے لوگ انہیں اپنا سپوت کہہ کر بجا طور پر فخر کرنے لگے تھے۔ ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے بعد پارٹی بنیادوں پر الیکشن کا اعلان ہوا تو موصوف جے یو آئی کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابی اکھاڑے میں اترے۔ وہ رابطہ عوام مہم کے سلسلہ میں جہاں جاتے لوگ عقیدت کے پھول نچھاور کرتے اور دیدہ و دل فرش راہ بن جاتے۔ اگرچہ دو مرتبہ چیئرمین

ضلع کونسل رہنے والے فضل کریم کنڈی عرف لٹی خان انتخابی حریف بن کر سامنے آئے لیکن بری شکست کھائی۔ ایم این اے منتخب ہونے کے بعد مولانا فضل الرحمان کے دل میں بین الاقوامی لیڈر بننے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنے آبائی ضلع کی بجائے اسلام آباد کو مسکن بنالیا۔ ادھر ایم کیو ایم کے تعاون سے مرکز سمیت سندھ و سرحد میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ لیکن مولانا نے بے نظیر گورنمنٹ کی حمایت کی بجائے عورت کی حکمرانی کو اسلام کے منافی اور قوم کے لئے نحوست قرار دیکر اپوزیشن کے ساتھ بیٹھنا پسند کیا۔ اس عمل سے قومی سطح پر ان کے وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے باشندوں سے رشتہ توڑ کر خود کو قبائلی سرداروں تک محدود کر لیا۔ اس سلوک کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ تکریم کی جگہ کدورتوں نے لے لی اور عوامی محبت نفرتوں میں بدل گئی۔ اسی دوران صدر غلام اسحق خان نے حکمرانوں کے اللوں تللوں کو دیکھ کر صوابدیدی اختیارات کے تحت اسمبلیوں کو چلتا کیا۔ غلام مصطفی جتوئی نگران وزیراعظم بنے۔ نئے انتخابات کی تاریخ مقرر ہوئی تو مولانا کو ایک بار پھر ووٹروں کے پاس جانا پڑا۔ اس مرتبہ لوگوں کے تیور بدل چکے تھے۔ وہ جہاں جاتے تلخ و تیز جملے تواضع کو ملتے۔ ووٹروں نے مبینہ اہانت آمیز سلوک کا جی بھر کر بدلہ چکانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ مولانا نے تاویلوں کا سہارا لیکر صفائی پیش کرنا چاہی لیکن اعتماد بحال کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ اس مرتبہ بھی فضل کریم کنڈی پی پی پی کے ٹکٹ پر انتخابی حریف بن کر میدان میں اترے تھے۔ اور نہایت آسانی کے ساتھ اپنی سابقہ شکست کا بدلہ چکا کر مولانا کو نہایت کربناک ناکامی سے آشنا کر دیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ موصوف اصلاح کی خاطر خود احتسابی کے عمل سے گزر کر اپنی کوتاہیوں و کمزوریوں کا ازالہ کرتے اور کھلے دل سے خان عبدالولی خان کی طرح اپنی شکست تسلیم کرتے لیکن انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لئے بغیر اپنی ناکامی کو نواز شریف کے سر تھوپ دیا۔ اور نواز حکومت کے ہر اقدام کو غلط و خلاف شریعت ثابت کرنے کا ورد شروع کر دیا۔ موجودہ وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی جو اس وقت وزیر مملکت تھے کو بطور خاص ہدف تنقید بنا کر نواز شریف کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا۔ جب جائز و ناجائز اعتراضات والزامات سے مطلوبہ نتائج کا حصول ممکن نظر نہ آیا تو پھر خود کو مذہب کا شیدائی ثابت کرنے کے لئے پبلک جلسوں میں مغربی جمہوری نظام حکومت کو نفاذ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے کر مسلح جہاد کے اعلانات دہرانے شروع کئے۔ واقف حال اس وقت بھی سمجھ رہے تھے کہ یہ سب پیٹ کا مروڑ ہے۔ اگر جذبہ جہاد ہوتا تو بندوق اٹھا کر کشمیر چلے جاتے۔ یا پھر افغانستان میں روسی فوجوں کا مقابلہ کرتے۔ چونکہ گفتار اور کردار میں تضاد نمایاں و عیاں تھا۔ اس لئے کسی نے باتوں بلکہ بڑھکوں پہ کان نہ دھرا۔ دریں اثنا وزیراعظم اور صدر مملکت کے مابین شکر رنجیاں پیدا ہوئیں۔ پی پی پی نے موقع کو غنیمت جان کر نواز شریف حکومت کو ڈس مس کرنے کی گردان شروع کر دی۔ ادھر جمہوری نظام کو نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹ قرار دینے والے بزبان خود مجاہد مولانا نے نہ صرف پی پی پی کی ڈھولک پر دھمال ڈالا بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر اسمبلیوں کی تحلیل کے راگ الاپنے شروع

گئے۔ یہ ایک ایسا وقت تھا کہ موصوف نواز اسحٰق چپقلش سے بھر پور فائدہ اٹھاتے ہوئے بذریعہ آرڈیننس شریعت کے نفاذ کا فرمان جاری کرا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے ثانوی حیثیت دے کر جمہوری چیمپئین بننے کی غرض سے از سر نو انتخابات کو ضروری سمجھا۔ حیران کن امر یہ ہے کہ جب پہلی بار غلام اسحٰق خان نے صوابدیدی اختیارات کے تحت بینظیر حکومت کو گھر کی راہ دکھائی تو انہی مولانا نے صدر کے مبیّنہ اقدام کو ناجائز، بلا جواز، غیر جمہوری اور غیر اخلاقی کہنے کے علاوہ کیا کیا نام نہ دیئے۔ لیکن اب وہی مولانا اخلاقیات سے ماورٰی جمہوری اصولوں اور شرعی تقاضوں کو خاطر میں لائے بغیر صدر مملکت سے اسی اقدام و فرمان کا مطالبہ کرنے لگے جس کے لئے صدر غلام اسحٰق خان کو مغضوب سمجھا جاتا تھا۔ "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیئے"۔ چونکہ فضل کریم خان کنڈی بحیثیت ایم این اے خاطر خواہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے لوگ ایک بار پھر مولانا کی طرف مائل ہوگئے۔ اور برسرعام کہا جانے لگا کہ چاہے مولانا ایم این اے منتخب ہونے کے بعد ووٹروں کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کریں کم از کم اسمبلی میں بے زبان تو نہ بنے رہتے۔ ۱۹۹۳ء کے الیکشن کے وقت فضا مولانا کے لئے خاصی سازگار تھی لیکن انہوں نے پی پی پی کے امیدوار فضل کریم کنڈی کو انتخابی اکھاڑے سے باہر رکھنے کی خاطر صوبہ سرحد کی حد تک پیپلز پارٹی کے ساتھ انتخابی گٹھ جوڑ کیا۔ اس خود غرضانہ عمل سے موصوف کے متقی ہونے کا پول کھل گیا۔ انہوں نے خدا پر بھروسہ کرنے کی بجائے پیپلز پارٹی کا سہارا لیا۔ جس سے دین دوست ووٹروں کو انتہائی صدمہ پہنچا۔ خود جے یو آئی کے نظریاتی حامی نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی صورتحال سے دوچار ہوئے۔ کیونکہ کل تک وہ پیپلز پارٹی کو سیکولر اور سامراج ایجنٹ جماعت کہنے کے علاوہ عورت کی حکمرانی کو غیر شرعی اور نحوست ثابت کرنے کے لئے کتاب و سنت اور احادیث کا سہارا لیا کرتے تھے اب وہ کس زبان اور منہ سے پی پی پی کو اسلام دوست اور عورت کی حکمرانی کو عین اسلامی قرار دینے کے علاوہ "بی بی" کی پاک دامنی کے قصے بیان کریں گے۔ اس اتحاد کے نتیجہ میں مقامی سطح پر جے یو آئی (ف) کے بہی خواہوں کی واضح اکثریت کبیدہ خاطر ہو کر مخالف صفوں میں شامل ہو گئیں۔ مولانا فضل الرحمان کو بروقت اپنی غلطی بلکہ خود غرضی کا احساس ہوا۔ انہوں نے جیتی بازی کو ہارتے دیکھ کر مختلف تاویلوں کے ذریعہ دین دوست طبقہ اور نظریاتی حامیوں کو مطمئن کرنے کے ہزار جتن کئے۔ لیکن گری تھوک کو چاٹنا ممکن نہیں رہا انتخابی مہم کے سلسلہ میں جہاں جاتے توہین آمیز کلمات استقبال کرتے۔ بالآخر انہوں نے علاقائی گروپوں کے ساتھ معاہدہ کرنے میں عافیت سمجھی۔ کلاچی سب ڈویژن میں سابق وزیر اعلیٰ سرحد سردار عنایت اللہ خان گنڈہ پور جنہوں نے وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالنے کے فوراً بعد اپنے پیش رو فضل الرحمٰن کے والد گرامی مولانا مفتی محمود کے خلاف قرطاس ابیض شائع کیا تھا سے امداد طلب کی۔ چونکہ گنڈہ پور سردار کی مسلم لیگ (ن) کے امیدوار سردار عمر فاروق خان میاں خیل کی فیملی کے ساتھ دیرینہ مخاصمت چلی آرہی ہے۔ اس لئے وہ بلا تامل مولانا فضل الرحمان کی حمایت پر کمر بستہ ہوگئے۔ اسی طرح حلقہ پی ایف ۵۳ یعنی پہاڑ پور، بلوٹ سرکل میں اہل تشیع کے ووٹ

حاصل کرنے کی غرض سے مخدوم آف بلوٹ شریف کے ساتھ یہ ساز باز کی کہ وہ آزاد امیدوار مخدوم زادہ مرید کاظم شاہ کے مقابلہ میں صوبائی نشست پر اپنے بھائی مولانا لطف الرحمان کو کھڑا کریں گے۔ تاکہ کٹر مولویوں، جے یو آئی اور سپاہ صحابہ کے نظریاتی حامیوں کے ووٹ جمیعتہ العلماء پاکستان کے امیدوار عصمت اللہ مستی خیل یا مسلم لیگی امیدوار جاوید اکبر خان کی بجائے لطف الرحمن کو ملیں۔ جبکہ مخدوم خاندان اس کے بدلے اہل تشیع سمیت اپنے زیر اثر لوگوں کے ووٹ مولانا فضل الرحمان کے حق میں پول کرانے کے پابند ہوں گے۔ مخدوموں نے اپنے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے پورے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں بالعموم اور پہاڑ پور سرکل میں بالخصوص اہل تشیع کے تقریباً نوے فیصد ووٹ مولانا کے حق میں پول کرا کر وہ کمی پوری کر دکھائی جو جے یو آئی کے حامیوں کے رخ موڑنے سے پیدا ہوئی تھی۔ جے یو آئی اور این ایف جے کے اس انتخابی اتحاد سے فریقین نے جہاں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی وہاں، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی حد تک پائی جانے والی سنی، شیعہ کشیدگی بھی تقریباً ختم ہوگئی۔ کیونکہ عام لوگ بہ آسانی سمجھ گئے کہ ایک دوسرے کو گردن زدنی قرار دینے والے اپنے مفادات کے حصول کی خاطر کس طرح ایک ہوگئے۔ گزشتہ سال عاشورہ محرم کے دوران جے یو آئی کے بعض عہدیداران نے ایک بار پھر شکایات کا پلندہ کھولنا چاہا لیکن ضلعی انتظامیہ کے اوپر کے اشارہ پر سیلاب زدگان کے لئے آنیوالے بیت المال فنڈ سے اوپن چیکوں کی فراخدلانہ تقسیم شروع کی۔ پانچ چیک مولویوں کے ملتے تو تین ضلعی انتظامیہ کی جیبوں میں چلے جاتے۔ اگر اس ضمن میں کوئی شبہ ہو تو نیشنل بینک کی مقامی مین برانچ کے ریکارڈ سے بہ آسانی تشفی کی جاسکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس اقدام سے بعض حقیقی سیلاب زدگان حکومتی امداد کے حصول سے محروم رہ گئے۔ لیکن خوش کن بات یہ ہے کہ محرم الحرام کے دوران ریکارڈ امن قائم رہا۔ اب اسے ملی یکجہتی کونسل کا کمال سمجھیئے یا اوپن چیکوں کا اعجاز۔ بہر کیف مولانا فضل الرحمان کی کامیابی مخدوم فیملی کی رہین منت ہے۔ اگر پہاڑ پور سرکل میں اہل تشیع کے ووٹ مولانا کی بجائے کسی دوسرے امیدوار کو ملتے۔ تو مولانا کی کامیابی کسی طور بھی ممکن نہ تھی۔ یہاں یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اپنے قریب ترین انتخابی حریف سردار عمر فاروق کے مقابلہ میں چند سو ووٹوں کی عددی اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ ممبر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد مولانا فضل الرحمان نے پی پی پی کے دامن میں پناہ لے کر یہ مشہور کیا کہ ان کا صدر مملکت فاروق احمد خان لغاری کے ساتھ اسلامی امور کے بارے میں معاہدہ ہوا ہے۔ اس لئے خاتون وزیر اعظم کا ساتھ دیا جارہا ہے۔ ادھر محترمہ بے نظیر بھٹو نے مولانا کے لاشعور میں اٹھکیلیاں لینے والی آرزو کو بھانپ کر انہیں قومی اسمبلی میں خارجہ امور کی سٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا تاکہ وہ بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کی خواہش پوری کرسکیں۔ پجیرو، انٹرکولر، سٹاف کار اور مسلح باڈی گارڈ فراہم کرنے کے علاوہ یورپی ممالک کے دوروں پر جانے کی کھلی چھٹی دے دی اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا لطف الرحمان کو سوشل ایکشن بورڈ ڈی آئی خان کا چیئرمین مقرر کیا۔ ان مراعات سے بین الاقوامی سطح پر مولانا کے سیاسی قد کاٹھ میں کوئی اضافہ ہوا ہو یا نہ۔ لیکن ملکی سطح پر لغاری وزرداری سے یاری اور

بی بی کی روا و ناروا پاسداری نے اسے سیاسی لحاظ سے بونا بنا دیا۔ کل تک سردار آصف احمد علی مغضوب تھے اب معصوم عن الخطا بن گئے (معاذاللہ)۔ اسی طرح محترمہ بے نظیر کی کوتاہیاں، کمزوریاں اور سیکولر مزاج خوبیوں میں نیکیوں کا مرقع نظر آنے لگا۔ اگرچہ پیپلز پارٹی کی حمایت کے بعد مولانا فضل الرحمان نے ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے سوئی گیس کی فراہمی۔ گومل ڈیم منصوبے کی تعمیر۔ ریلوے لائن بچھانے۔ صنعتی ترقی کے لئے خصوصی پیکج حاصل کرنے کے بلند و بانگ دعوے کئے تھے۔ لیکن دو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود متذکرہ منصوبوں میں سے کسی کی افتتاحی تقریب منعقد نہ ہو سکی۔ بلکہ موصوف اپنی کارکردگی کو بجلی کے ٹرانسفارمروں کی تنصیب اور پبلک کال آفس کھولنے تک محدود کئے ہوئے ہیں۔ بعض ناقدین کے مطابق مولانا خود اپنے آبائی ضلع کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہاں ترقی ہو اور لوگ آسودہ حال بنیں کیونکہ اس طرح ان کی سیادت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ویسے اس قسم کے الزامات اس لحاظ سے وزنی معلوم ہوتے ہیں کہ انہیں پورے ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن یعنی اپنے حلقۂ نیابت میں کوئی اس قابل نظر نہ آیا جسے سفارت کا عہدہ دلاتے یا پروجیکٹ ڈائریکٹر سوشل ایکشن بورڈ.....اور تو چھوڑیئے ان کا پرائیویٹ سیکرٹری تک برآمد کردہ ہے۔ جہاں تک ترقیاتی منصوبوں کے لئے انکی مساعی کا تعلق ہے تو اسکا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً نواز شریف دور میں مقامی ائیرپورٹ کی توسیع۔ ڈیرہ ژوب نیشنل ہائی وے روڈ کی تعمیر اور سپیشل صنعتی زون کی منظوری ہوئی تھی لیکن موجودہ حکومت نے ان منصوبوں کے لئے مختص کردہ فنڈ دوسری جگہ منتقل کر دیئے۔ یا پھر انہیں بستۂ خاموشی میں ڈال دیا۔ گویا ان ہی کی عدم دلچسپی کے باعث ترقیاتی منصوبوں پہ قدغن لگی۔ علاوہ ازیں بعض دیگر ایسے واقعات بھی منظر عام پہ آئے جس سے مولانا کے وقار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ یعنی ان کی حقیقی والدہ، اور سوتیلی ماں کی وفات کے موقع پر ضلعی انتظامیہ نے لاکھوں روپے کے اخراجات کے بل ادا کئے جو سربستہ راز نہ رہ سکے۔ مولانا سمیع الحق کے میڈم طاہرہ سیکنڈل کی طرح لطف الرحمان سکینڈل مشہور ہوا۔ رہ گئی نفاذ اسلام کے ضمن میں مولانا کی جدوجہد تو اس کا اندازہ گزشتہ دو سالوں کی کارکردگی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مولانا سمیع الحق کے شریعت بل کو شرارت بل کہنے والے نے اسمبلی میں اپنا اصلی حقیقی شریعت بل پیش کرنے کے بلند و بانگ دعوے کئے تھے لیکن انہیں ان ممالک کے سیر سپاٹے سے فرصت نہیں جہاں شراب و شباب اور سیکس پر پابندی نہیں۔ نہ معلوم وہ گوری چمڑیوں والوں کے ہاں کس مشن پر جاتے ہیں۔ اگر مقصد تبلیغی و اصلاحی ہے تو پھر اسکی ابتداء اپنے گھر یعنی وطن عزیز سے کرنی چاہیئے تھی۔ دیارِ غیر میں قومی سرمایہ لٹانے کا فائدہ کیا؟

یہاں تو نفاذِ اسلام کے لئے تحریکیں چل رہی ہیں۔ یورپ و امریکہ میں کون شریعت محمدی کے نفاذ کا طلبگار ہے؟ گزشتہ سال ڈیڑھ سال کے دوران صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع سمیت بعض ملحقہ قبائلی علاقوں میں نفاذِ شریعت محمدی کی تحریکیں پر زور انداز میں رونما ہوئیں عام خیال تھا کہ مولانا فضل الرحمان اور جماعت اسلامی کے قائد قاضی حسین احمد و مولانا سمیع الحق جو صوبہ سرحد کے باشندے ہیں بذات خود ان

تحریکیوں کی پیشوائی فرمائیں گے۔ کیونکہ یہ اصحاب پاکستان کے علاوہ ہمسایہ ممالک افغانستان و بھارت میں شرعی قوانین کے نفاذ کے زبانی طلبگار رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے دیر، باجوڑ، مالاکنڈ اور کوہستان وغیرہ میں شریعت محمدی کے طلبگاروں کی عملاً کوئی امداد نہ کی۔ اسی طرح باجوڑ خیبر ایجنسی میں شریعت کے نام لیواؤں پر جو بیتی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اسلامیانِ سرحد کو یقین تھا کہ نفاذ شریعت کے لئے مسلح جدوجہد کا دعویدار ضرور میدانِ عمل میں اتر کر اسلاف کے نام کو روشن کرے گا، لیکن صد افسوس کہ شرکت اقتدار کے سرور نے اسے ایسا مدہوش کر دیا کہ حکومت کی کوئی برائی، برائی نظر نہیں آئی۔ اب وہ حکمرانوں کے کسی فعل بد کو ناروا کہنے کے روادار نہیں۔ گزشتہ سال حکومت نے صوبہ سرحد کے سکہ بند قادیانی مبلغ قلندر مومند کو ان کی نعتیہ شاعری پر پاکستان کا سب سے بڑا سول اعزاز یعنی ستارہ امتیاز بخشا۔ باخبر حلقوں کے مطابق یہ سب وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کے ہم زلف کا اعجاز و کمال ہے جس نے ایک قادیانی مبلغ کو نعت گو قرار دیکر سب سے بڑا سول قومی اعزاز دلوایا۔ کون پوچھے کہاں مرزائی اور کہاں اسکی نعت خوانی "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔" یہاں یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل بھی ایک مرزائی چیف سیکرٹری صاحبزادہ امتیاز احمد نے اسی قلندر مومند کو حسنِ کارکردگی کا صدارتی تمغہ دلوایا۔ یہ بات آج بھی گومل یونیورسٹی کے ریکارڈ میں موجود ہوگی اور پروفیسر پریشان خٹک جو اس وقت بقید حیات ہیں اس بات کے گواہ ہیں کہ جب وہ گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان کے وائس چانسلر اور قلندر مومند ان کے ماتحت لاء کالج کے پرنسپل تھے تو ان دنوں سنڈیکیٹ میٹنگ میں مسٹر مومند کی سرگرمیوں کے بارے میں سی آئی ڈی کی رپورٹ زیر بحث آئی۔ جسے غیر مؤثر بنانے کے لئے صدر مملکت کی جانب سے عطا کردہ حسن کارکردگی کا سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا۔ اور یہ ثابت کیا گیا کہ جس شخص کو سربراہِ مملکت نے ایوارڈ سے نوازا ہو وہ کیونکر وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوسکتا ہے۔ گویا صدارتی ایوارڈ تحفظ کا سبب بنا۔ جبکہ آئندہ تمغہ امتیاز سول اور وہ بھی نعت گوئی کے اعتراف میں مسٹر قلندر مذکور کو کھرا مومن مسلمان ثابت کرنے کے لئے کافی وشافی نہ ہوگا؟ اب پوچھا جائے علماء کرام و پیرانِ عظام سے کہ کن مصلحتوں نے ان کے لبوں پہ تالے لگائے؟ کیا وہ مسئلہ ختم نبوت پر بھی سودا بازی پہ تیار ہوگئے؟ یہ ایک الگ المناک و دلگداز حقیقت ہے کہ صوبہ سرحد میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کے علمبرداروں کی جو درگت بنی اس پر مولانا فضل الرحمان کی خاموشی اسلئے باعث تعجب نہیں کہ وہ اس صف میں شامل ہیں جن کے نزدیک نفاذِ اسلام کا مطالبہ بغاوت سے کم نہیں۔ اور صوبہ سرحد کے چیف سیکرٹری کو ان کی خصوصی آشیر باد حاصل ہے۔ لیکن اس ضمن میں جماعت اسلامی کی عملاً لاتعلقی اب تک سوالیہ نشان بنی رہی؟ یہ عقدہ حال ہی میں کھلا کہ جماعت والے دیر، باجوڑ و سوات وغیرہ کو اپنا پاکٹ ایریا سمجھتے ہیں۔ صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی سے ان کے کاروبار سیاست کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں تحریک والوں کی ان علاقوں میں حقیقی عملداری قائم نہ ہو جائے۔ بنا بریں قاضی حسین احمد نے عملاً ساتھ دینے کی بجائے زبانی

جمع خرچ سے کام چلانا مناسب سمجھا۔ جب صوبائی انتظامیہ نے میجر مست گل کے دوروں اور جلوسوں کی راہ میں معمولی روڑے اٹکائے تو جماعت اسلامی کے خورد و کلاں پکار اٹھے کہ یہ سب بااختیار قادیانی کا کیا دھرا ہے۔ اور اس ضمن میں چیف سیکرٹری کو بلیک میل کرنے کی غرض سے اخباری بیانات بھی جاری کئے لیکن جب تحریک نفاذ شریعت محمدی والوں کی درگت بنائی جارہی تھی تو جماعت والوں کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ سب کچھ کس کے اشارے پہ ہو رہا ہے۔ کیا مولانا فضل الرحمان، قاضی حسین احمد اور مولانا سمیع الحق کو یہ معلوم نہیں کہ اعجاز رحیم قلندر مومند۔ شکیب احمد جنرل منیجر پی ٹی سی۔ شریف احمد کمشنر کوہاٹ اور ریاض احمد کون ہیں؟ کیا یہ درست نہیں کہ فی الوقت ہمارے مذہبی پیشواؤں کو مرزائی افسروں اور ان کے ہم خیال چیلوں سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں اس لئے خاموشی کو شعار بنائے ہوئے ہیں اور اگر کل ذاتی مفادات پہ ضرب پڑی تو فتووں کی گولہ باری شروع ہوجائیگی اور یہی قابل قبول قابل نفرین بن جائیں گے۔ حال ہی میں حکومت نے دینی درسگاہوں کی آڈٹ کا شوشہ چھوڑا تو سب سے زیادہ مولانا فضل الرحمان سیخ پا ہوئے۔ آخر اس میں قباحت کیا ہے کہ پتہ چلے کہ کس کس دینی مدرسہ کی آمدنی کیا ہے کہاں سے آتی ہے اور کیسے خرچ ہوتی ہے یا کی جاتی ہے؟ بعض حلقوں کے مطابق موصوف نے سیاست میں قدم رکھتے ہی اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اندرون ملک چندہ کی وصولی کے علاوہ عرب امارات اور لیبیا تک دورے کئے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وصولی کس قدر ہوئی۔ ویسے واقف حال لوگوں کے مطابق کروڑوں روپے جمع ہوئے۔ خود جے یو آئی کے دیرینہ رکن گل شیر نے یونیورسٹی قائم نہ ہونے کے بعد حساب و کتاب کو منظر عام پہ لانے کا مطالبہ کیا تو وہ بیچارہ معتوب ٹھہرا۔ شنید ہے کہ آج بھی مولانا کی زیر سرپرستی قائم "جامعۃ المعارف شرعیہ" نامی دینی درسگاہ کی ماہوار آمدنی لاکھوں روپے ہے۔ جبکہ اخراجات کا تخمینہ چند ہزار روپے سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح ہمارے جماعت اسلامی کے بھائی قربانی کی کھالیں جمع کرنے کی غرض سے سٹال سجالیتے ہیں اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جماعت کے اخراجات اس قسم کی آمدنی سے پورے کئے جاتے ہیں۔ لیکن امیر جماعت قاضی حسین احمد کے دلبند کی شادی کے ولیمہ پر لاکھوں روپے کے اخراجات کو دیکھ کر لوگ ششدر رہ گئے کہ اسراف سے منع کرنے والے اس قدر فراخدلی سے دولت کیوں اڑاتے ہیں۔ ان کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی۔ کیا یہ سب کمائی اسلام کے متبرک نام پہ نہیں ہو رہی؟ ہمارے ان مذہبی پیشواؤں کے قول و عمل میں نمایاں تضاد کی وجہ سے سادہ لوح اسلامیان پاکستان ان سے برگشتہ خاطر ہو رہے ہیں۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ کفر کے فتوے کیوں صادر کئے جاتے ہیں اور ایک کلمہ گو کے ذریعہ دوسرے بھائی کی گردن کیوں کٹوائی جاتی ہے۔ ایک طرف ختم نبوت ﷺ کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں دوسری طرف قادیانیوں سے یارانے۔ ایک طرف دین اسلام کی اشاعت و ترویج دینی مدارس کا قیام دوسری جانب علماء کرام کے بچوں کا انگلش میڈیم سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کا عمل۔ اسی قسم کی دوعملی اور گفتار و کردار میں تضاد نے علماء کا امیج تباہ کر دیا ہے۔ اب

(بقیہ ص ۴ پر)